McGill University Library
3 103 505 999 N

ىكرام
ل
يقي

mG4

MHI
.S5688uk

PRESSBOARD
PAMPHLET BINDER
Manufactured by
GAYLORD BROS. Inc.
Syracuse, N. Y.
Stockton, Calif.

MH1 .S5688uk
INSTITUTE
OF
ISLAMIC
STUDIES
6800 ★
McGILL
UNIVERSITY

سلسلہ مطبوعات اقبال اکیڈمی (۵)

'Ulamā-e kirām kā mustaqbil

علمائے کرام کا مستقبل

Siddiqi

مرتبہ

مظہر الدین صدیقی۔ بی۔ اے

(حیدر آباد دکن)

شائع کردہ
دفتر اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاج پورہ۔ لاہور

قیمت آٹھ آنے

MHI
.S5688UK

عُلمائے کرام کا مُستقبل

تالیف

مولوی محمد مظہر الدین صاحب صدیقی، بی۔ اے

شائع کردہ

اقبال اکیڈیمی۔ ظفر منزل تاج پورہ

لاہور

قیمت ۸/ ——— محصولڈاک ۲/

2626618 islm

بار اوّل مارچ ۱۹۴۲ء

مطبوعہ دین محمدی پریس لاہور۔ باہتمام سیّد محمد شاہ ایم اے پرنٹر و پبلشر
و شائع شد از دفتر اقبال اکیڈیمی۔ ظفر منزل۔ تاج پورہ لاہور۔

عُلَمائے کِرام کا مُستقبل

عُلَمَاءِ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ :- ایک مشہور و معروف حدیث ہے جو لفظاً موضوع سہی مگر حقیقتاً بالکل صحیح و درست ہے۔ دُنیا کی ہر قوم و جماعت میں حرکت و ترقّی کا ولولہ اور سعی و جہاد کا جذبہ اُسی وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک اُس میں ایسے افراد کثیر تعداد میں پیدا ہوتے رہتے ہیں جن میں رہنمائی کی قابلیّت کے ساتھ عِلم و فضل، وُسعتِ نظر، اخلاق کی دیانت اور کردار کی راستی موجُود ہو۔ جس قوم میں ایسے افراد کی کمی ہو، سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کے انحطاط و زوال کا وقت آن پہنچا ہے۔

مسلمانوں میں رہنمائی کا منصب اور قیادت کا درجہ ہمیشہ سے علماء کو حاصل رہا ہے۔ ان کی حیثیت صرف یہی نہیں ہے کہ وہ دین و شریعت کے محرمِ اسرار اور مراسم و شعائر مذہبی کے نگران ہیں بلکہ دنیوی رہنمائی اور سیاسی رہبری بھی انہیں کا حِصّہ ہے دُوسری قوموں میں دینی پیشواؤں کی حیثیت صرف اتنی ہے کہ وہ اپنی مذہبی کتابوں کے عالم اور مراسم

6800

وظواہر مذہبی کے نگہبان ہیں۔ اس لیئے ان کا کام نہ تو اتنا دشوار ہے اور نہ اس کے لئے اکتسابِ علم اور فرائض مذہبی کی پابندی کے علاوہ اور کسی چیز کی ضرورت ہے۔ لیکن اسلام نے جب دین و دُنیا کی تفریق اُٹھائی اور سیاست و معیشت کے تصوّرات کو مذہبی نظام میں جگہ دی تو دینی پیشواؤں اور مذہبی رہنماؤں کی سابقہ حیثیّت بھی بدل گئی۔ اب وہ علمِ دین کے نمائندے ہی نہ تھے بلکہ دُنیوی اور تمدّنی امُور بھی ان کے دائرہ اقتدار میں آگئے اور حکومت و فرمانروائی کا تختِ جلال بھی ان کے قدموں سے لپٹ گیا۔ اس دوگونہ حیثیت کی وجہ سے علمائے اسلام کا مرتبہ جتنا بُلند اور اُن کا منصب حیات جتنا اعلیٰ ہوگیا اُن کے فرائض اتنے ہی متنوّع اور ان کی ذمّہ داریاں اسی قدر سنگین ہو گئیں۔ ان کے لیئے یہ کافی نہیں رہا کہ وہ علمِ نظری اور کتابی معلُومات پر قانع ہو جائیں۔ وہ اگر اپنا اصلی مقام حاصل کرنا چاہتے تو نہ صرف علم و فضل کے اعتبار سے بلکہ عملی صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی انہیں ایک امتیازی درجہ حاصل کرنا پڑتا اور یہ نہ صرف اس وجہ سے کہ ایک حقیقی اسلامی رہنما کے لیئے دنیوی تجربہ اور سیاسی تدبّر ناگزیر صفات ہیں بلکہ اس سبب سے بھی کہ مذہب کی حقیقت کا ادراک اور شریعت کے مصالح سے واقفیّت بغیر اس کے ناممکن ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش اور ماحول کی قوتوں پر گہری نگاہ رکھے اور ان تمام فکری رجحانات اور علمی تحریکات کو سمجھ سکے جو کسی خاص دور کو اس کی امتیازی خصوصیات

عطا کرتے ہیں تاکہ اسلامی تحریک کے فکری یا عملی پہلو پر کیسا ہی شدید حملہ ہو وہ اُس کی حفاظت و صیانت کا حق ادا کر سکے +

حضور رسالتمآب کی زندگی میں اور اس کے بعد خلافت راشدہ کے دَور میں جبکہ حکومت و جہانبانی مذہبی اعمال اور دینی اُمور ایک ہی جگہ جمع تھے اس کام کو جس حُسن و خوبی سے انجام دیا گیا وہ اسلامی تاریخ میں آپ اپنی نظیر ہے۔ صحابۂ کرام مذہب کے اسرار و رموز کے محرم بھی تھے شریعت پر مجتہدانہ نظر بھی رکھتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ تدابیر مملکت اور انتظام حکومت کا بار بھی اُٹھائے ہوئے تھے۔ قدرتاً ان کی فکر آزاد ان کی نظر وسیع اور ان کی بصیرت بے خطا تھی۔ ان کی نگاہ علم و فضل کے کسی خاص گوشہ تک محدُود نہ تھی بلکہ اس کا دائرہ عملی زندگی، سیاسی کاروبار اور امور مملکت تک وسیع تھا +

لیکن اس کے بعد جو دور آیا اس میں دنیوی حکومت اور دینی اقتدار کی یکجائی کا خاتمہ ہوگیا۔ حکومت و فرمانروائی کی باگ ایسے اشخاص کے ہاتھوں میں آگئی جو نہ شریعت کے حامل تھے اور نہ مذہب کے امانت دار۔ دینی اقتدار اور دنیوی حکومت کی اس تفریق نے خرابی کا پہلا بیج بویا۔ جو امتدادِ وقت اور حالات کی رفتار کے ساتھ خُوب پھلا پھُولا۔ پھر بھی اسلام نے مسلمانوں میں حریت فکر اور علوئے اخلاق کی جو زندگی بخش رُوح پھُونک دی تھی اُس نے حالات کو زیادہ بگڑنے نہیں دیا۔ اگرچہ علمائے اسلام دنیوی جاہ و جلال اور

حکومتی اقتدار کے شوکت و اثر سے محروم ہو گئے تھے لیکن ان کی حق پرستی اور ضمیر داری کی طاقت ایسی نہ تھی جس سے وقت کی حکومتیں بالکل بے پروا ہو جاتیں۔ تابعین اور تبع تابعین کے دَور میں اور اس کے بعد بھی عرصہ تک علمائے اسلام کی حق گوئی ان کی آزادئ فکر وضمیر، مال و متاع دنیوی سے ان کا استغنا ارباب حکومت اور اصحاب اقتدار کے نفوذ و اثر سے ان کی بے خوفی غرضیکہ ان کے بے شمار اوصاف اور مکارم اخلاق اسلامی تاریخ کے صفحات پر اب تک نقش ہیں۔

لیکن اس کے بعد جب امّت پر اخلاقی انحطاط و زوال کا دور آیا تو عام مسلمانوں کی طرح علماء بھی اس سے متاثّر ہوئے بلکہ ایک لحاظ سے ان کے اعمال و اخلاق عامۃ النّاس سے کہیں زیادہ پست ہو گئے۔

سلاطین اور امراء ابتداء سے اس کوشش میں مصروف تھے کہ ان کی عیش پسندیوں، ستمرانیوں اور کامجوئیوں کی راہ سے مذہب کے اوامر و نواہی اور شریعت کے حدود کی روک نکل جائے تاکہ ان کے اعمال پر کوئی شخص حرف گیری نہ کر سکے۔ اور آزادانہ اظہار حق ان کے فتنہ انگیز عزائم کا حریف نہ رہے۔ یہ چیز اُس وقت تک ناممکن تھی جب تک علماء کی جماعت میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا جذبہ نتائج کے خوف اور دنیوی عقوبتوں کے ڈر پر غالب تھا۔ جب تک عیش و راحت کی کشش مال و متاع کی خواہش اور جاہ و اقتدار کی ہوس، ایثار و قربانی کی رُوح سے مغلوب تھی۔ لیکن جب

اخلاقی انحطاط وزوال نے عام مُسلمانوں کی طرح علماء کو بھی آدبوچا تو ارباب اقتدار اور امراء و سلاطین کی بن آئی۔ اب اُن کے لئے آسان ہوگیا کہ دُنیا کا لالچ اور دولت کی طمع دلا کر علماء کو رام کر لیا جائے اور انہیں اس فرض کی ادائیگی سے باز رکھا جائے جس کی انجام دہی ان کی گردن پر خدا کی امانت کا سب سے بڑا بار تھی چنانچہ سلاطین و امراء کو اس معاملہ میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی یہ حالت پھر بھی اتنی مہلک نہ تھی لیکن اس کے بعد فساد و زوال کی انتہائی صورت نمودار ہوئی اور وہ دور آیا جب علماء نہ صرف اپنے فرائض سے غافل ہوگئے بلکہ دُنیا کی طمع نے انہیں ارباب اقتدار اور بادشاہوں کے اغراض کا آلۂ کار اور عوام الناس کی عجائب پسند ظواہر پرستی اور ان کی قدامت فکر و خیال کا معاون و مددگار بنا دیا۔ اخلاق کی پستی کے ساتھ فکری جمُود اور نظر کی تنگی نے سونے پر سُہاگے کا کام کیا مذہب کی حقیقی رُوح اُن میں سے یکسر مفقود ہوگئی۔ روایت پرستی اور تقلید کی بندشوں میں گرفتار ہوگئے۔ ایک طرف تو وہ صاحبان اثر و اقتدار کی خوشامد میں کتاب و سنت کی غلط تعبیریں کرنے لگے اور احکام شریعت کے اس حصّہ پر پردہ ڈالنے لگے جس کا تعلق اجتماعی فلاح و صلاح اور ارباب حکومت کی ذمّہ داریوں سے ہے اور دُوسری طرف وہ عوام کی خوش اعتقادیوں اور اُن کی مشرکانہ رسوم پرستی کے ساتھی ہوگئے کچھ اس لئے بھی کہ اس میں

انہیں کا فائدہ تھا - ان میں آزادیٔ رائے کی جرأت اور حق پرستی کی بیباکی نہ عوام کے مقابلہ میں باقی رہ گئی اور نہ اصحاب دولت و اثر اور امرا و سلاطین کے مقابلہ میں - عام مسلمانوں کی اخلاقی پستی نے اُمّت کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا علماء کی روحانی بے مائگی اور نفس پرستی نے - کیونکہ عوام تو اندھی تقلید کے عادی تھے اور علماء کے قدم بہ قدم چلنا چاہتے تھے - اس لئے جب اس طبقہ میں زوال آیا تو اس کے اثرات پُوری اجتماعی زندگی میں سرایت کر گئے اور عام مُسلمان تیزی کے ساتھ اس ادبار و انحطاط کی طرف بڑھنے لگے جدھر ان کے رہنماء انہیں لئے جا رہے تھے +

ایک بڑی خرابی جو امتداد وقت سے علماء میں پیدا ہوگئی وہ یہ تھی کہ ان میں سے اجتہاد فکر اور آزادیٔ رائے کا مادہ سلب ہو گیا - اسلامی فقہہ کو وہ ایک ایسا بندھا ٹکا نظام خیال کرنے لگے جس میں کسی ترمیم و تجدید کی گنجایش نہ تھی - یا تو وہ زمانہ تھا کہ سیاسی اور معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ ہی علمائے اسلام نے اسلامی فقہ کی ترتیب کا بیڑا اُٹھایا اور اپنی ان تھک کوششوں سے ایک ایسا قانونی نظام منضبط کیا جو تاریخ میں آپ اپنی مثال ہے یا یہ حال ہؤا کہ زمانہ کی بڑی سے بڑی تبدیلی اور حوادث و واقعات کے بڑے سے بڑے بھونچال بھی اسلامی فقہ کو اپنی جگہ سے آگے نہ بڑھا سکے اور جس کسی نے اس صُورت حال کے خلاف احتجاج کیا

اور قانونِ شریعت میں ترمیم و اضافہ کی ضرورت پر زور دیا اسے کافر و ملحد اور زندیق کے خطابات سے سرفراز ہونا پڑا۔ اس واقعہ سے تو غالباً کسی کو بھی انکار نہ ہوگا کہ خلفائے راشدین کے زمانہ اور بنی امیہ کے ابتدائی دورِ حکومت میں فقہ، حدیث، رجال اور اسی نوع کے دیگر علوم کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اسلام ایک سادہ مذہب تھا جس میں قانونی پیچیدگیوں اور علمی موشگافیوں کو کوئی دخل نہ تھا۔ چند مسلمہ عقائد تھے جن پہ یقین کر لینا مسلمان بننے کیلئے کافی خیال کیا جاتا تھا بعض مخصوص اعمال و عبادات تھے جن کی پابندی اسلامی زندگی بسر کرنے کے لئے کافی تھی۔ پھر یہ سوال قدرتاً پیدا ہوتا ہے کہ یہ علوم و فنون کیونکر وجود میں آئے اور وہ کیا اسباب و محرکات تھے جنہوں نے مسلمان اہلِ علم کو اس جانب مائل کیا۔ یہ تو تھا نہیں کہ بیٹھے بیٹھے یکبارگی انہیں اس ضرورت کا احساس پیدا ہو گیا اور وہ اس کے لئے مصروفِ عمل ہو گئے نہ کسی وحی و الہام نے ان کے دلوں میں یکایک یہ جذبۂ عمل بیدار کیا۔ بس اس سوال کا جواب ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ زمانہ کی ضروریات اور ماحول کے وہ مطالبات جو اسلامی سلطنت کی توسیع اور غیر مسلم قوموں سے میل ملاپ کی وجہ سے اجتماعی زندگی کی سطح کو متلاطم کئے ہوئے تھے انکی علمی کوششوں اور فنی کامیابیوں کا باعث تھے۔ نئے نئے معاشی اور معاشرتی مسائل رونما ہو رہے تھے۔ حکومت کا سابقہ قانونی نظام ان مسائل کے حل سے عاجز تھا ایسی

حالت میں علماء نے اس امر کو محسوس کیا کہ اگر انہوں نے ایک نیا قانونی نظام نہ ترتیب دیا تو اسلامی سلطنتیں اس بات پر مجبور ہو جائیں گی کہ وہ اپنے قانونی نظام کی تکمیل و توسیع کے لئے غیر مسلم قوموں کے قوانین سے مدد لیں۔ اور بلا شبہ اگر اُس عہد کے علماء اسلامی فقہ کی ترتیب و تدوین نہ کرتے تو نتیجہ یہی ہوتا۔ اِسی ضرورت نے ان میں سے ایک گروہ کو احادیث کے جمع و ترتیب کی طرف مائل کیا دوسرے کو علم رجال کی طرف متوجہ کیا اور تیسرے کو تفسیر اور علم قرآن کا شوق دلایا۔ یہ سب علوم درحقیقت اسلامی فقہ یا اسلام کے قانونی نظام نے پیدا کئے کیونکہ جب تک یہ علوم درجۂ اعتبار تک نہ پہنچ لیتے اسلامی فقہ کی تکمیل غیر ممکن تھی ٭

لیکن اُس کے بعد جب اسلامی سلطنتوں کا شیرازہ بکھرا حالات نے اچانک رُخ بدلا اور مغربی سلطنتوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار و تسلّط کے ساتھ یورپ کی علمی، سیاسی اور معاشی تحریکات اسلامی نظام کی حریف ہو گئیں تو علماء کا ذہن و دماغ اتنا ماؤف ہو چکا تھا اور وہ تقلید و اجداد پرستی کی بندشوں میں کچھ اس طرح گرفتار ہو گئے تھے کہ انہوں نے ان نئے حالات اور ان کے اسباب و علل کو سمجھنے تک کی کوشش نہ کی اور اپنے پُرانے شکستہ مورچوں پر جمے رہے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے اس سیلاب کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں جو اُن کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا اور جس کی رَو میں

اِسلامی نظام تہس نہس ہو رہا تھا۔ اُنھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اسلامی فقہ جس کو مخصوص حالات کے ماتحت مرتب کیا گیا تھا ان حالات کے ختم ہونے کے بعد اصلاح و ترمیم کی محتاج ہے کیونکہ معاشرتی اور معاشی مسائل جو اُس کی پیدایش کا سبب تھے وہ اب باقی نہیں رہے تھے اور جس قِسم کی حکومت چلانے کے لئے یہ قانونی نظام ترتیب دیا گیا تھا اس کی فِطرت، اور ہیئت ظاہری بالکل متغیّر ہو گئی تھی اس کے فرائض اور ذمّہ داریوں کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ اس کے لئے عبّاسیہ دَور کا قانونی نظام بالکل ناکافی تھا۔ لیکن ہمارے علماء تو ترمیم و اصلاح کا نام سنتے ہی آگ بگولا ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ اس کو آئمۂ فقہ کی توہین خیال کرتے ہیں کہ ان کے تجویز کئے ہوئے مجمُوعہ قوانین میں کسی اضافہ یا ترمیم کی ضرورت پر زور دیا جائے۔ یہیں سے اس بات کا ثبُوت مِل جاتا ہے کہ ہمارے عُلماء شخصیتوں اور اصُولوں میں امتیاز کرنے کی صلاحیت بالکل نہیں رکھتے ہیں۔ شخصیّت پرستی ان کے ذہن میں اس طرح رچ گئی ہے کہ وہ اس کے لئے ہر طرح کی قربانی دینے پر آمادہ ہیں اگر قدیم اسلامی فِقہ کے بعض اجزاء موجودہ حالاتِ زندگی سے بالکل میل نہیں کھاتے ہیں تو انہیں اس کی پرواہ نہیں ہے اگر موجُودہ معاشی ضروریات اور حالات کی وجہ سے اس پرانے نظام کے کچھ احکام بالکل ساقط ہوُئے جاتے ہیں تو بھی انہیں اپنی جگہ سے ہلنے کی

ضرورت نہیں ہے ان کی نظروں میں ہماری قدیم فقہ بالکل اسی طرح زمانہ اور حالات کی تبدیلیوں سے بے نیاز ہے جس طرح قرآن اور احادیثِ صحیحہ۔ حالانکہ فقہ اگر کوئی مفہوم ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ ایک خاص زمانہ کی ضروریات پوری کرنے کا ایک قانونی نظام ہے جسے قرآن وسنّت سے مستنبط کیا گیا ہے +

بے شک قرآن اپنی جگہ ایک غیر متبدّل حقیقت ہے اور اسی طرح وہ حدیثیں بھی جن کی صحت ہر معیار سے پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہو، لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ انسانی تعلقات کی شکل و نوعیت، اجتماعی ضروریات، طرزِ معاشرت غرضیکہ زندگی کا ہر طریقہ بدل جاتا ہے اور اگر قانون ان تبدیلیوں کا کوئی لحاظ نہیں کرتا ہے تو وہ عملاً ساقط ہو جائے گا خواہ اعتقادی حیثیت سے وہ اپنی جگہ اٹل ہی کیوں نہ ہو اس کیلئے نہ اُن اصولوں کے بدلنے کی ضرورت ہے جس پر قانون کا دار و مدار ہے نہ اُس تصوّرِ حیات اور طرزِ تفکر میں ترمیم و اصلاح کی ضرورت ہے جو اس نظام کا مآخذ ہے اور نہ قانون کے اُس جزو میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہے جس کا تعلق ابدی حقائق اور انسانی فطرت کی غیر متغیر صفات سے ہے صرف ضرورت اس کی ہے کہ نئے ماحول اور بدلے ہوئے حالات کے اقتضا سے اُن اصولوں اور اس تصوّر پر نظر ڈالی جائے اور قانونی نظام کو

اس طرح بدلا جائے کہ وہ نئی ضروریات کا بھی ساتھ دینے لگے اور ان اصُولوں سے بھی منحرف نہ ہو جن پر اس کی بنیاد قائم ہے +

ہندوستان میں انگریزی تسلط کے قیام نے نہ صرف سیاسی نظام کو بدلا بلکہ ہندوستانیوں کی معاشرت و تہذیب اور ان کے طرز تفکر پر بھی اپنا اثر ڈالا۔ سیاسی نظام کے بدلتے ہی معاشی تنظیم نے اپنا رُخ پھیرا اور معاشی مشکلات نے اپنے جلو میں نئے نئے تہذیبی اور معاشرتی مسائل پیدا کر دیئے۔ ان تمام تبدیلیوں نے مسلمانوں کے ذہن و خیال کو بھی متاثر کیا اور رفتہ رفتہ ان کے مذہبی اور اخلاقی تصورات کی کایا پلٹ ہو گئی۔ لیکن اس پُورے دَور میں جو انقلاب برپا ہُوا اس سے ہمارے علماء کے افکار میں ایک معمولی سی جنبش بھی پیدا نہ ہوئی۔ اُنھوں نے ان نوزائیدہ تحریکات سے بالکل آنکھیں بند کر لیں اور انہیں نظر انداز کر دینا چاہا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں میں مذہب کے خلاف ایک فکری بغاوت شروع ہو گئی اور اِن کے دل و دماغ رفتہ رفتہ اسلام سے ہٹنے لگے کیونکہ جس نظر سے وہ اپنی زندگی کے مسائل کو دیکھتے تھے وہ اسلامی طرز کے بالکل برعکس تھی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ہمارے علماء ان نئے مسائل کا حل اسلامی نقطۂ نظر سے پیش کرتے اور اس طرح سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ذہن

پر غیر اسلامی افکار و تصورات کا سکہ نہ جمنے دیتے۔ آج حالت یہ ہے کہ مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ کا ایک بڑا حصہ اسلام سے برگشتہ ہو چکا ہے اور اعلانیہ اشتراکی عقائد اختیار کرتا جا رہا ہے۔ لیکن علمائے اسلام خاموشی سے اِس منظر کو دیکھ رہے ہیں اور یا تو اپنے حجروں میں بیٹھے تسبیح خوانی میں مصروف ہیں یا اس نام نہاد جنگ آزادی کے سُورما بنے ہوئے ہیں جس کا مقصد اس ملک میں اسلامی تہذیب و ثقافت کے نشانات کو چُن چُن کر مٹانا اور ایک ایسی حکومت کی بنا ڈالنا ہے جس میں مسلمان مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے شریک ہو سکتا ہے ان فریب خوردہ مسلمان نوجوانوں کے سامنے اشتراکیت کے مفاسد و خطرات کو پیش کرنا اور یہ سمجھنا کہ اس عمل سے وہ اسلام کی طرف پھر واپس لائے جا سکتے ہیں کوئی نتیجہ نہیں پیدا کر سکتا ہے اوّل تو جب تک اشتراکیت کی تحریک پُوری طرح کامیاب نہ ہو جائے یہ خطرات و مفاسد ایک امکانی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی واقعیت کا ثبُوت دینا غیر ممکن ہے دوئم اِس قسم کی سلبی دلیلوں سے تعلیم یافتہ اشتراکیوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ اشتراکی کہتا کہ آپ کو اشتراکی نظام میں انسانی فلاح کا کوئی امکان نہیں نظر آتا ہے تو اس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا نظام پیش کیجئے جو موجودہ معاشی مشکلات کو حل کر سکے۔ آپ اسلامی نظام کو پیش کرتے

ہیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ ایک پُرانا اور فرسُودہ نظام ہے جو موجُودہ حالات سے عہدہ برآء ہونے کی اہلیّت نہیں رکھتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ اسلام نے سرمایہ داری کو مٹانے کے لئے سُود کی ممانعت کر دِی ہے وہ جواب دیتا ہے کہ سُود کو مٹا کر آپ معاشی زندگی کی تنظیم کِس طرح کریں گے بڑی بڑی صنعتوں کو کس طرح چلائینگے اور ان کے لئے سرمایہ کہاں سے فراہم کریں گے۔ ظاہر ہے کہ ان سوالات کا جواب نہیں دیا جا سکتا ہے جب تک قرآن و حدیث کے گہرے مطالعہ کے ساتھ موجُودہ معاشی نظامات اور سیاسی تحریکوں سے واقفیّت نہ پیدا کی جائے۔ اگر علماء کا منصب حقیقی یہ ہے کہ وہ اسلامی نظام کے محافظ اور اسلامی تحریک کے نگہبان ہیں تو کیا موجُودہ علماء اپنے فرائض منصبی کو واقعی انجام دے رہے ہیں؟ کیا انہیں اشتراکیت کے فلسفہ، اس کے اسباب و محرکات اور اس کے تجویز کردہ معاشی نظام کا کوئی تفصیلی علم ہے؟ پھر اشتراکیت تو ان بے شمار تحریکات میں سے ایک ہے جو موجُودہ زمانہ کی پیداوار ہیں۔ اسلام کا مقابلہ ان سب تحریکات اور نظریات سے ہے۔ اور اسلامی نظام کی حفاظت و صیانت کا حق اس وقت تک ادا نہیں کیا جا سکتا ہے جب تک کہ علمی سطح پر ان تمام تحریکات کو شکست نہ دے دی جائے کیا ہمارے علماء نے کبھی اس کام کی جانب توجّہ کی ہے؟ کیا ان کا کوئی ادارہ اس طرح کا کوئی علمی

کام انجام دے رہا ہے جس کا مقصد غیر اسلامی تصوّرات وافکار کی بیخ کنی ہو؟ پھر کس منہ سے وہ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم انہیں علماء کے زمرہ میں شمار کریں اور ان کے سامنے عقیدت کی گردنیں خم کریں۔ جو لوگ وقت کے تقاضوں اور ماحول کے موثرات اور اپنے زمانہ کی علمی اور فکری تحریکات سے اس قدر بے خبر ہوں وہ اس مذہب کے علمبردار اور اس نظام شریعت کے حامل کس طرح کہے جاسکتے ہیں جو انفرادی زندگی سے زیادہ اجتماعی زندگی پر زور دیتا ہو، حقوق اللہ سے زیادہ حقوق العباد کا خیال دلاتا ہو اور جس کا اوّلین مطالبہ حکومتِ الٰہیہ کا قیام و نفاذ ہو۔ اگر اسلام صرف ایک علمی نظریّہ ہوتا یا عیسائیت کی طرح چند اخلاقی مواعظ یا نصائح پر اکتفا کر لیتا اور حکومت کے تصوّر سے بالکل خالی ہوتا یا پھر نئے مذہب کی طرح فرد کی روحانی نجات کا تصوّر اس کے تمام اصُول و مبادی کا سرچشمہ ہوتا جن کو دنیوی امُور اور تمدّنی مسائل سے کوئی تعلق نہ ہوتا تو ہمارے موجُودہ علماء مسلمانوں کی قیادت کا فرض بخوبی انجام دے سکتے۔

مگر مشکل تو یہ ہے کہ دُوسرے مذاہب کے برخلاف اسلام کا ایک تمدّنی اور معاشی نظام بھی ہے جو اس وقت تک رُوبعمل نہیں لایا جاسکتا ہے جب تک کہ اسلامی شریعت پورے طور پر نافذ نہ ہو جائے لیکن اس شریعت کا نفاذ خود اس بات پر موقوف

ہے کہ زمانہ کے جدید رجحانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس شریعت کو ضروریاتِ زمانہ کے مطابق بنایا جائے ◆

ایسے حالات میں وہ لوگ کس طرح یہ ضروری فرض انجام دے سکیں گے جو زمانہ کی تحریکات سے بے خبر اپنے تمدّنی ماحول سے ناواقف اور ان قوتوں کے فہم و ادراک سے قاصر ہیں جو اس نظام کی مخالف اور اس کے لئے تباہ کن ہیں ؟ اس جہل و بے خبری کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے علماء مذہبی مسائل کی تشریح اور قرآن و سنت کی تعبیر میں فہم و تدبّر کے جدید تقاضوں کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ ہر زمانہ کے علمی اور تمدّنی مسائل جُدا ہوا کرتے ہیں اور کوئی مذہبی نظام اس وقت تک اپنی زندگی برقرار نہیں رکھ سکتا ہے جبتک کہ وہ ان مسائل کو اپنے مخصوص اندازِ فکر کے مطابق حل کرنے میں کامیاب نہ ہو جائے۔ مثلاً ایک زمانہ وہ تھا جب صفات باری کے قِدم و حدُوث اور خلقِ قرآن کی بحثیں گرم تھیں حشر و نشر کے مسائل اور جنّت دوزخ کے تصوّرات فکر و نظر کا موضوع تھے۔ اور مذہب کی صداقت اس معیار پر پرکھی جاتی تھی کہ آیا وہ ان مسائل کو تشفّی بخش طور پر حل کر سکتا ہے یا نہیں۔ اُس زمانہ کے علماء کیلئے ناگزیر تھا کہ وہ ان مسائل کا مطالعہ قرآن و سنت کی روشنی میں کریں اور مخالفین کو اسلام کی صداقت کا قائل کر دیں یا جن مسلمانوں کے دلوں میں ان سوالات کی وجہ سے شکوک و شبہات پیدا ہو گئے تھے

افراد کا ذکر اُوپر گزر چکا ہے وہ دل ہی دل میں اپنے طبقہ کی حالت پر کُڑھتے ہیں اور اپنے محدُود دائرہ میں ان خرابیوں سے محفوظ رہنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں جو ان کے طبقہ کی عام فضا کو مسموم کئے ہوئے ہیں لیکن حقیقت میں وہ بیچارے بالکل بے بس ہیں ان میں آج تک کوئی ایسا مرد مجاہد نہیں پیدا ہوا جو اس صُورت حال کے خلاف عملی طور سے احتجاج کرے اور علماء کو اُن کے فرائض اصلی کی طرف متوجّہ کرے یا ان خرابیوں کی جڑ کاٹے جو طبقۂ علما میں عام مسلمانوں کی طرح پیدا ہو گئی ہیں +

اب پہلی جماعت کو لیجئے یعنی وہ علماء جو مذہبی درسگاہوں میں زندگی گزارتے ہیں۔ ان کی شخصی زندگی بڑی غنیمت ہوتی ہے کیونکہ ان کا سارا وقت ایک علمی ماحول میں گزرتا ہے۔ لیکن علمی حیثیت سے ان کی اور ان کی درسگاہوں کی افادیّت میں بہت کچھ کلام ہے ان مذہبی درسگاہوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے اُس کا طریقہ فی الجملہ ناقص ہوتا ہے کیونکہ فنّ تعلیم کی جو نئی تحقیقات ہوتی رہی ہیں اور طریقہ تعلیم میں جو اصلاحات ہوئی ہیں وہ ہماری مشرقی درس گاہوں میں ابھی تک نہیں پہنچ سکی ہیں اور نہ شائد آئندہ پہنچ سکیں تعلیم کے نصاب میں اگرچہ قدیم زمانے سے اب تک بہت سی جُزوی تبدیلیاں عمل میں آئی ہیں لیکن کوئی بنیادی اصلاح اب تک نہیں ہو سکی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان درس گاہوں

کی تعلیم ختم کرنے کے بعد بھی طلباء کا ذہنی افق اسی طرح تاریک رہتا ہے۔ چونکہ ہماری مذہبی تعلیم کے نصاب میں زمانہ جدید کے مسائل سے بالکل صرف نظر کر لیا جاتا ہے اسلئے مذہبی درسگاہوں کے فارغ التحصیل طلباء زمانہ کی نئی تحریکات اور جدید طریق فکر سے اسی طرح بیگانہ ہوتے ہیں جس طرح کہ خود ان کے معلّم۔ لیکن سب سے بڑی خرابی ان درس گاہوں کی یہ ہے کہ وہ تقلیدانہ شخصیّت پرستی کے مسکن ہیں جہاں ہر نئے خیال کو کفر و زندقہ خیال کیا جاتا ہے اور ہر جزوی معاملہ میں اختلاف رائے یا اجتہاد کی کوشش کو سختی سے دبا دیا جاتا ہے ابھی حال تک ہمارے علماء کی یہ حالت تھی کہ وہ ہر مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے سب سے پہلے آئمہ کے اقوال کو بطور سند پیش کرتے تھے۔ لیکن اگر اس کے بعد بھی کسی کو اختلاف کی جرأت ہوتی (اور ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا)، تو احادیث کا سہارا لیا جاتا اگر بد قسمتی سے معاملہ اس پر بھی ختم نہ ہوتا تو بڑی مجبوری سے کلام مجید کی طرف رجوع کیا جاتا۔ بحث و استدلال کا یہ طریقہ صدیوں سے اسی طرح چلا آ رہا ہے اور اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ اسلامی شریعت کے جمود اور ٹھہراؤ کی ذمہّ داری تمامتر علماء پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے معاملہ کی فطری ترتیب بالکل الٹ دی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے کہ ہر معاملہ میں قرآن کو حکم بنایا جائے اس کے بعد بھی اگر اختلاف رائے کی گنجائش باقی رہے تو احادیث و سنن کو بیچ

میں لایا جائے اور اس پر بھی اگر تصفیہ نہ ہو تو آئمہ کے اقوال سے مدد لی جائے ۔ بہرحال ہماری مذہبی درسگاہوں سے جو طلبا فارغ ہو کر نکلتے ہیں ان میں سے اجتہاد کی قوّت بالکل فنا ہو جاتی ہے ۔ زمانہ تعلیم میں مسلمہ عقائد کے خلاف کوئی بات زبان سے نکالنا ان کے واسطے غیر ممکن ہے ۔ اختلاف رائے کو وہاں آئمہ و اسلاف کی توہین خیال کیا جاتا ہے ۔ کیونکہ ہمارے علماء کا خیال یہ ہے کہ اخلاف پر مذہبی اجتہاد کا دروازہ بالکل بند کر دیا گیا ہے ۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو بات کسی امامِ وقت اور فقیہہ زمانہ نے ایک خاص نہج سے طے کر دی ہو اس میں اختلاف رائے کی آزادی عطا کی جائے ۔ اس ذہنیت اور اس فضا میں پرورش پانے کے بعد طلباء کے علم کا حال ظاہر ہے ۔ جدّت اور اپج کی عام سوتیں بند کر دی جاتی ہیں اور انسانی دماغ میں صرف حافظہ اور منفعلانہ انجذاب کی قوتوں کو نشوونما کا موقع دیا جاتا ہے ۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان درس گاہوں کے کسی طالب علم سے آپ سیاسی گفتگو کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ سیاست میں بھی علماء کے مسلک کی پیروی کو فرض عین خیال کرتا ہے ۔ اور اس مسلک کی پیروی میں وہ دلائل سے اتنا زیادہ متاثر نہیں ہوتا ہے بلکہ اپنے اساتذہ کی شخصیتوں سے ۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح مذہبی علوم میں تقلید روایت پرستی اور شخصیت پرستی کی فضا کی وجہ سے اجتہاد اور آزادی رائے کی صلاحیت اُس میں سے بالکل

فنا ہو جاتی ہے اسی طرح سیاسیّات کے دائرہ میں بھی خود غور و فکر کرنے کی اہلیّت سے وہ عاری ہوتا ہے۔ جو بنی بنائی رائے یا مسلک اس کے ذہن میں اتار دیا جاتا ہے اس کو وہ مکمل طور سے جذب کر لیتا ہے اور اس سے اختلاف کرنا اس کے لیئے غیر ممکن ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کل ان درس گاہوں سے جتنے طالبِ علم نکلتے ہیں وہ سب کے سب کانگریسیّت کی نجاست سے آلودہ ہو جاتے ہیں۔ وطنیّت کا وہ تصوّر جو اسلامی نظام کے لئے سمِّ قاتل ہے ہماری مذہبی درس گاہوں کے ذریعے مسلمانوں میں ترقّی کرتا جا رہا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ان سیاسی تصوّرات کو طلباء کے ذہن میں راسخ کرنے کے لئے کوئی ارادی کوشش کی جاتی ہو کیونکہ ایک ایسے ماحول میں جس کا امتیازی وصف تقلید، اکابر پرستی اور اصولوں سے زیادہ اشخاص کی اطاعت والفت ہو محض اساتذہ اور معلّمین کا کسی خاص سیاسی مسلک پر عامل ہونا اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ طلبا بھی اسی مسلک کے پَیرو ہوں گے۔ اگر ان سب باتوں کے بعد بھی لوگ ان درس گاہوں کی افادیّت کے قائل ہوں تو ہمیں کچھ عرض کرنا نہیں ہے۔

اِس کے بعد دُوسری جماعت کا نمبر آتا ہے جس کا کام وعظ بیان کرنا ہے اگر ان لوگوں نے مذہب کو کمائی کا ذریعہ نہ بنایا ہوتا تو یہ بہت کچھ کام کرسکتے تھے لیکن جب وعظ و تقریر کے صلہ میں کچھ نفع

حاصل کرنے کی توقع ہو تو ظاہر ہے کہ واعظ یا مقرر اس بات کا خاص طور سے خیال رکھیگا کہ وہ جو کچھ کہے سامعین (جو زیادہ تر جہلا اور عوام ہوتے ہیں) کے پسندیدہ خیالات و عقائد کے خلاف نہ ہو خواہ یہ خیالات و عقائد کتنے ہی گمراہ کن کیوں نہ ہوں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام النّاس کے جذبات کو مخاطب کرنے کی غرض سے اور ان میں مقبولیت حاصل کرنیکے ارادہ سے وہ انکی عجائب پسندی سے فائدہ اُٹھاتے ہیں اور مذہب کا ایسا تصور اُن کے سامنے پیش کرتے ہیں جو انکے توہمات سے قریب تر ہو۔ آپ کسی واعظ کو مجمع کے سامنے اس قسم کی تقریر کرتے ہوئے بہت کم سنیں گے جس کا مقصد انکو عمل کی طرف راغب کرنا اور یہ بتانا ہو کہ نماز روزہ اور جملہ عبادات کا مقصد و منتہا نیک عملی کی زندگی بسر کرنا انصاف و دیانت رواداری اور اخوت سے مل جُل کر رہنا اور فتنہ و فساد سے اپنے تئیں محفوظ رکھنا ہے اور اگر تمام عبادات کے باوجود لوگ جھوٹے مکّار بدمعاملہ اور کینہ پرور رہیں تو عبادت کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے اس کے برخلاف آپ انہیں اوراد و وظائف کی فضیلتوں پر فصیح و بلیغ تقریر کرتے سنیں گے۔ اعمال کی اصلاح کا تذکرہ آپ اُن کی زبان سے کم سُنیے گا۔ غرض یہ لوگ مذہب کا وہ تصوّر پھیلاتے ہیں جس سے بے عملی اور جمود کی صفات پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے یہ ہے کہ عوام اور جہلاء کے نزدیک مذہب کا مفہوم گنڈے تعویذ اور دعائیں کرنا اور نماز روزہ پر میکانکی طور

سے عمل کرنا ہے ان کے خیال میں نفس اعمال کی اصلاح سے مذہب کو کم واسطہ ہے بلکہ وہ مراسم وعبادات اور وظائف کا ایک مجموعہ ہے۔ اس لئے واعظین کو مذہب کے اس تصوّر کی پاسداری کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر وہ مذہب کو اس کی حقیقی شکل میں پیش کریں اور عوام میں عمل کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کریں تو شائد ایک مرتبہ کے بعد دوسری بار ان کو وعظ کرنے کے لئے مدعو نہ کیا جائے۔ اس صُورت میں انہیں انٹر کلاس کا کرایہ کہاں سے ملے گا اور قورمہ پلاؤ کون کھلائے گا۔ مذہب کو کمائی کا ذریعہ بنانے سے یہ تمام بُرائیاں پیدا ہوتی ہیں ∴

اس کے بعد مشائخ عظام اور پیرون کی کثیر التعداد جماعت سامنے آتی ہے۔ جس نے مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریّت کو اپنے قبضۂ اثر میں لے رکھّا ہے یہ اُن صُوفیائے کرام اور بزرگوں کی اولاد یا جانشین ہیں جنہوں نے اپنے عمل کے زور سے اپنی مثال کے اثر اور اپنے قلب ونظر کی طہارت سے مسلمانوں میں ایمان ویقین کی روشنی پھیلائی اور غیر مسلموں کو دولت اسلام سے مالا مال کیا طریق بیعت وارادت کا جو حقیقی مقصد ہے اُس سے کسی مسلمان کو اختلاف کی جرأت نہیں ہو سکتی ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ہدایت فرمائی ہے کہ نیک اور سچّے لوگوں کی صحبت اختیار کرو :۔ وَكُونُوا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ، کسی جماعت میں مذہب کی حقیقی رُوح اُسی

وقت پیدا ہو سکتی ہے جب اس میں ایسے افراد موجود ہوں۔ جو اس رُوح کو اپنے عمل میں مجسّم کرتے ہوں اور اپنی شخصیّت کا اثر دُوسروں پر ڈال کر انہیں بھی اس رُوح کا عملی مظہر بنا سکتے ہوں اور یہ اس بات پر موقوف ہے کہ لوگ ان اثر آفرین شخصیّتوں سے اتّصال پیدا کریں ان کی قربت حاصل کریں اور ان کی معیّت و رفاقت میں اپنا زیادہ سے زیادہ وقت صرف کریں۔ یہ ہے بیعت کا اصلی فلسفہ لیکن جس طرح مذہب کے اور شعبوں میں اصل حقیقت مسخ ہو چکی ہے اور صرف ظواہر کا نظر فریب پردہ اصلیّت کے چہرہ کو چھُپائے ہوئے ہے اسی طرح یہاں بھی حقیقت حال کچھ اَور ہے +

ارشاد و ہدائت کا یہ کام جو دلوں کو پاک اور سینوں کو منوّر کرتا تھا اب معاش کا ایک اور وسیلہ اور آمدنی کا ایک ذریعہ ہو گیا ہے اب پیروں کے لِئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنے عمل و کردار کی وجہ سے اس منصب کے اہل ہوں بلکہ ان کا کسی ولی یا بزرگ کی اولاد ہونا یا کسی مشہور خاندان سے تعلّق رکھنا ہی اس بات کی ضمانت ہوتا ہے کہ وہ اس دشوار کام کو خاطر خواہ طریقہ سے انجام دیں گے۔ چنانچہ جب کوئی پیر و مرشد وفات پا جاتا ہے تو اس کے بعد اُس کی اولاد خود بخود اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ اور مریدوں کی ارادت و عقیدت کا رُخ اپنے مرحُوم پیر و مُرشد کی اولاد کی طرف پھر جاتا ہے گویا کہ اس منصب کی اہلیّت ذاتی انتساب اور جہد و عمل سے نہیں

پیدا ہوتی ہے بلکہ وہ ایک طرح کی مقدّس امانت ہے جو باپ کے بعد اس کے بیٹے کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ حالانکہ تزکیہ نفوس اور اور تصفیہ قلوب کی قوت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو عمل صالحہ اور پابندی شریعت کے بغیر نسل، بہ نسل باپ سے بیٹے کو وراثت میں ملتی رہے اور یہ بہت ممکن ہے کہ ایک شخص نے عمل صالح اور مجاہدہ نفس کے ذریعہ سے اس منصب کی اہلیت پیدا کی ہو لیکن اس کا بیٹا ان صفات سے قطعاً عاری ہو جنہوں نے باپ کو اس کا اہل بنایا تھا۔ لیکن اب یہی چیز وراثت کا ایک حق بن گئی ہے اور مریدوں کا جم غفیر آنکھ بند کر کے اپنی عقیدت مندیوں کو مرشد کے بعد اس کے بیٹے یا پوتے کی طرف منتقل کر دیتا ہے +

اس پورے سلسلہ میں کُونُوا مَعَ الصّٰدِقِیْن کی حقیقت کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ مریدوں کی جماعت پیر و مرشد کے فیض صحبت سے اپنے اخلاق و اعمال کی اصلاح کرتی لیکن آجکل مرید ہونے کا مطلب بس اس قدر ہے کہ کسی مرشد کے ہاتھ پر بیعت کر لی جائے۔ اس کے بعد اور کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے نہ مرشد کے ہدایات و نصائح کی اور نہ اس کی معیت و رفاقت اختیار کرنے کی۔ زیادہ سے زیادہ چند وظائف اور دعائیں مرید کو سکھا دی جاتی ہیں جن کو رٹتے رہنے سے توقع کی جاتی ہے کہ زندگی کی بہت سی مشکلات خود بخود حل ہو جائیں گی۔ یہ وظائف اور دعائیں

مرید کے لئے بے عملی کا پروانہ ہیں کہ ان کو پڑھتے رہنے سے سعی و کوشش اور اصلاح اعمال بے ضرورت ہو جاتی ہے۔ مریدین کے اعمال پر مرشد کی کوئی گرفت نہیں ہوتی ہے بیعت کے وقت مرید سے چند ایک رسمی وعدے لے لئِے جاتے ہیں کہ وہ شریعت کے احکام کی پابندی کرے گا اور مذہبی فرائض سے منہ نہ موڑیگا لیکن اس کے بعد مرشد کو خبر تک نہیں ہوتی ہے کہ مریدین اُس عہد کو پورا بھی کر رہے ہیں یا نہیں۔ پیر کی مسلسل صحبت ورفاقت جس کے بغیر اعمال کی درستگی اور باطن کی صفائی پیدا نہیں ہو سکتی ہے اب کہیں ڈھونڈھے سے بھی نظر نہیں آتی ہے بہت کم مرید ہیں جو روزانہ ایک گھنٹہ بھی اپنے پیر کی صحبت میں رہتے ہوں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پیر صاحب کسی اور شہر میں رہتے ہیں ور مرید ہزاروں کوسوں دُور کسی دوسرے شہر میں زندگی گزارتا ہے۔ برسوں ملاقات تک نہیں ہوتی ہے۔ کبھی کبھی خط وکتابت البتہ ہوتی ہے۔ لیکن وہ بھی جب مرید کو بیماری تنگی یا کوئی اور پریشانی ستاتی ہے اور پیر صاحب کی مدد طلب کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ان پیروں کی رعونت ونخوت ان کی سب سے بڑی شناخت ہے جب مریدوں کے جم غفیر میں کسی پیر صاحب کو دیکھئے تو بس یہ معلوم ہوگا کہ کوئی فرشتہ ابھی ابھی آسمان سے اترا ہے جس کا درجہ عام انسانوں سے بمراتب بلند ہے ان کا دربار کسی بادشاہ کا دربار معلوم ہوتا ہے جہاں مریدین

گردنیں جھکائے عقیدت کا سر خم کئے ہوئے پیر صاحب کے اشارہ کے منتظر رہتے ہیں، کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں ہوتی ہے۔ کبھی کبھی کوئی مرید جسے زیادہ تقرّب حاصل ہوتا ہے سلسلہ گفتگو شروع کرتا ہے اور پورا مجمع اس کی طرف متوجّہ ہو جاتا ہے۔ یہ ہے اُن لوگوں کا طرزِ عمل جو حضور رسالتمآب کی اُمّت کی رہنمائی کرنے اُٹھے ہیں دراں حالیکہ خود حضور نبی صلعم نے اس خیال سے کہ ان کے دربار میں کسی قسم کا فرق مراتب نہ ہو اور شخصیّت پرستی کا کوئی نشان باقی نہ رہے اپنے اصحاب کو منع فرما دیا تھا کہ وہ حضور کے تشریف لاتے وقت کھڑے نہ ہوا کریں۔ یہ تھی مساوات کی اسپرٹ جس کی تعلیم اُمّت کے پہلے ہادی نے دی تھی شاید ہمارے مشائخ عظام اور مرشدانِ کرام اپنے تئیں پیغمبر سے زیادہ عزّت و عظمت کا مستحق خیال کرتے ہیں۔ ایسے مرشدوں کی کثرت ہے جن کا روحانی فیض صرف دولت مند مریدیں کے حصّہ میں آتا ہے اور کسی غریب مرید کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھنا بھی وہ عار خیال کرتے ہیں۔ تعجّب کی بات یہ نہیں ہے کہ مرشدوں اور مشائخوں کے یہ اعمال و اخلاق ہیں تعجّب اس پر ہے کہ مسلمان سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی شخصیّت پرستی کے دام فریب میں اس بری طرح گرفتار ہیں کہ اس سے نکلنا روز بروز ان کے لئے دشوار تر ہوتا جاتا ہے ✤

اس پیر پرستی کا ایک شاخسانہ قبر پرستی کی لعنت ہے جس

نے مسلمانوں کی عملی قوتوں کو بُری طرح مجرُوح کر رکھا ہے۔ بزرگوں سے عقیدت و محبّت اور اولیاء اللہ کا احترام بجائے خود ایک معصوم بلکہ مستحسن جذبہ ہے لیکن موجودہ زمانہ میں یہی جذبہ مسلمانوں کو شرک فی الصفات پر آمادہ کر رہا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان میں جذبۂ عمل مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنے دست و بازو سے کام کریں، مشکلات پر غالب آئیں اور زندگی کو ایک جہادِ مسلسل سمجھ کر مخالف قوتوں سے نبرد آزمائی کریں اب ان کا حال یہ ہے کہ ذرا مشکل کا سامنا ہوا اور انہوں نے کسی درگاہ یا مقبرہ کا رُخ کیا۔ خدا کی ذات پر سے ان کا اعتماد روز بروز اُٹھتا جا رہا ہے ان کی عقیدتوں کا رُخ اب اُن بزرگوں اور ولیوں کی طرف ہوتا جاتا ہے جن کو وفات پائے ہوئے برسوں گزر چکے ہیں۔ لوگ درگاہوں پر فاتحہ پڑھنے کی غرض سے بہت کم جاتے ہیں بلکہ وہاں جا کر مرادیں طلب کرتے ہیں منتیں مانگتے ہیں۔ ہندوستان کے بعض حصّوں میں لوگ بلا روک ٹوک قبروں کو سجدے کرتے ہیں درگاہوں میں جا کر عرضیاں لٹکاتے ہیں۔ غرضیکہ طرح طرح کے مشرکانہ افعال کرتے ہوئے ذرہ برابر بھی نہیں شرماتے ہیں اس توہّم پرستی سے فائدہ اُٹھا کر مسلمانوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جس نے قبروں کو ذریعہ تجارت بنا رکھا ہے۔ ہمارے علماء ان سب چیزوں کو دیکھتے ہیں لیکن ان کے دل میں ذرا سی کھٹک تک نہیں پیدا ہوتی ہے

ان میں سے اکثر تو خود ان باتوں میں شریک ہوتے ہیں۔ بہت کم ہیں جو ان چیزوں کو بُرا سمجھتے ہیں اور جو لوگ اس خیال کے ہیں بھی تو ان میں سے بھی عَنِ المنکر کا جذبہ فنا ہو چکا ہے اور جرأت ایمانی مفقود ہو گئی ہے وہ ڈرتے ہیں کہ اگر وہ عام وبا کے خلاف احتجاج کریں گے تو عوام کی عقیدت کا سررشتہ ان کے ہاتھوں سے چھوٹ جائے گا۔ اور اس چیز کو اپنے ہاتھوں میں رکھنے کے لئے انہیں دُنیا کی ہر قربانی گوارا ہے۔ مدح صحابہ کی تحریک کو ہمارے علماء نے کس ذوق وشوق سے شروع کیا تھا کیونکہ اس سے ان کے سیاسی اغراض پُورے ہوتے تھے اور مسلمانوں کی ایک بڑی سیاسی جماعت میں تفرقہ پڑتا تھا۔ کبھی اس مردہ پرستی اور کھلے ہوئے شرک کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمارے علماء نے کوئی عملی اقدام کیا ہے یا کوئی تحریک شروع کی ہے؟ شائد اس سے ان کے اغراض کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

ہمارے علماء کی ایک عجیب وغریب ذہنیت جس کی وجہ سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو ہمیشہ نقصان اٹھانا پڑا یہ ہے کہ وہ خود مذہبی یا دنیوی اصلاح کا کوئی قدم نہیں اُٹھانا چاہتے ہیں اور نہ مسلمانوں کی معاشرتی تعلیمی اور معاشی خرابیوں کا کوئی علاج سوچتے ہیں لیکن جب دوسرے لوگ اس قسم کا کوئی علاج شروع کرتے ہیں تو وہ فوراً ان کی راہ میں آجاتے ہیں اور مذہبی نقطہ نظر سے اُن پر طرح طرح کے اعتراضات وارد کرنے لگتے ہیں یہاں تک کہ عوام اُن

لوگوں سے بدظن ہو جاتے ہیں اور ان کی شروع کی ہوئی تحریک پنپنے نہیں پاتی ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ علمائے کرام جو اعتراضات ایسی تحریکوں پر وارد کرتے ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر مذہبی نقطہ نظر سے صحت پر مبنی ہوتے ہیں ۔ لیکن اوّلاً دُنیا کی کوئی تحریک ایسی نہیں ہوتی ہے جس میں کمزوریوں اور نقائص کی آمیزش نہ ہو اور اگر اجتماعی مسائل میں اس نقطہ نظر کو پیش نظر رکھا جائے کہ کوئی اصلاحی تحریک اس وقت تک سر سبز نہ ہونے دی جائے جب تک کہ اُس میں نقص و فساد کا کوئی پہلو اور خطرہ کا کوئی امکان باقی ہے تو پھر ہمیں قیامت تک اپنی عملی قوتوں کو معطل رکھنا پڑے گا ۔ دوئم جب کسی تحریک میں کوئی کمزوری یا نقص نظر آئے یا اس کی وجہ سے اجتماعی زندگی کا کوئی پہلو خطرہ کی زد میں آجاتا ہو تو علماء کا فرض یہ نہیں ہے کہ وہ اس کی مخالفت میں شور و غوغا بلند کریں اور ایسے لب و لہجہ میں اس پر تنقید کریں جس کی وجہ سے اس تحریک کی جانب سے بدظنی پھیل جائے بلکہ صحیح طریقہ عمل یہ ہے کہ دوستانہ مشورہ اور ہمدردانہ تنقید کے ذریعہ بانیان تحریک پر اس کی کمزوریاں ، نقائص اور خطرات کھول دیں تاکہ اگر وہ مخلص ہوں تو اُن مفاسد کی اصلاح کر لیں ۔

لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تنقید و تعریض کا حق اُسی جماعت کو پہنچتا ہے جو خود کوئی ٹھوس کام کر رہی ہو ۔ یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ کوئی جماعت محض تنقید اور نکتہ چینی کیا کرے اور خود ہاتھ پر ہاتھ دھرے

بیٹھی رہے۔ لیکن ہمارے علماء عرصہ سے اس عادت میں مبتلا ہیں وہ خود تو مسلمانوں کی اصلاح کے لئے قدم نہیں اٹھائیں گے لیکن جب کوئی دُوسرا اس طرف توجہ کرے گا۔ تو اسکی کمزوریوں کو فاش کرنے اور اُسکے عیُوب کو طشت ازبام کرنے میں آگے رہیں گے +

ہندوستان میں سر سیّد کی تعلیمی تحریک کے متعلّق ہمارے علماء کا یہی رویہ تھا۔ سر سیّد نے جب علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی اور مسلمانوں میں مغربی علوم کی اشاعت کرنے لگے تو وہ تمام علماء جنہوں نے اب تک مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی رفع کرنے کے لئے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی تھی دفعتہً ہوشیار ہو گئے اداُن خطرات کا احساس کرنے لگے جو اس تعلیمی تحریک میں مضمر تھے۔ یہاں تک کوئی مضائقہ نہ تھا۔ لیکن اس کے بعد ہی علماء نے سر سید کی ذات پر حملے کرنے شروع کئے ان کو کافر ملحد اور بے دین کیا کچھ نہ کہا۔ غرضیکہ ان کے خلاف جی کھول کر زہر اُگلا۔ لیکن اس تحریک کے کامیاب ہونے کے بعد بھی انہوں نے مسلمانوں کو اُن خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے جن کا احساس ان کے دلوں کو بے چین کئے ہوئے تھا کوئی موثر عملی اقدام نہیں کیا بجز چند مدارس کے قیام کے جن میں تعلیم کا وہی فرسُودہ اور پُرانا نظام رائج تھا جس میں وقت کی تبدیلیوں اور تقاضوں کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہمارے علماء اجتماعی زندگی کے مسائل پر گہری نظر رکھتے ہوئے اور مذہب کو صرف وظائف، دُعاؤں،

داڑھی، اونچے پاجامے، تسبیح خوانی اور بہشت دوزخ کا معاملہ نہ خیال کرتے ہوتے تو سرسید نہیں بلکہ وہ خود انگریزی تعلیم کی اشاعت کا پہلا قدم اٹھاتے۔ کیونکہ انگریزی تعلیم کا پھیلانا وقت کا ایک ناگزیر تقاضا تھا جس کے اسباب بہت پہلے سے جمع ہو رہے تھے۔ ایک غیر ملکی حکومت کے سایہ میں ایک نیا تمدن پرانے تمدن پر غلبہ پا رہا تھا۔ انسانی افکار و تصورات کا پرانا نظام رفتہ رفتہ منہدم ہو رہا تھا اور اس کی جگہ نئے تصورات اور نظریات جن میں حرکتی قوتوں کا ایک خزانہ پوشیدہ تھا پرانے جامد و ساکن خیالات و افکار کی اینٹ سے اینٹ بجا چکے تھے۔ اس سیلاب کا روکنا قطعاً ناممکن تھا یہ اگر رکنے والا ہوتا تو اسی وقت رک جاتا جب انگریزوں نے ہندوستان میں پہلے پہل قدم جمانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نئی مغربی قوم کا ہندوستانی مسلمانوں اور اسلامی دنیا پر غلبہ اس حقیقت پر شاہد تھا کہ مسلمانوں کے تمدنی نظام کو جن افکار و محرکات نے غالب و حکمران بنایا تھا وہ یا تو مٹ چکے تھے یا مسخ ہو چکے تھے مغرب کا سیاسی غلبہ درحقیقت اس کے تمدنی نظام اور ان کے جاندار تصورات کا غلبہ تھا اس کے برخلاف اسلامی نظام جو اپنی اصلی حالت میں مغربی نظام تمدن سے زیادہ پائدار اور جان بخش تھا زندگی اور حرکت کی صفات سے عاری ہو گیا تھا۔ اس لئے اگر اس نئے سیاسی اور تمدنی غلبہ کو توڑنا مقصود تھا تو چاہیئے تھا کہ اس کے وہ صفات و

تصوّرات جنہوں نے اس کو غالب وحکمران کیا تھا بے دھڑک اسلامی نظام میں داخل کر لئے جاتے۔ مغرب کی سائنٹیفک ترقی اسکی قوّت تنظیم اور حرّیت فکر یہی وہ عناصر تھے جنہیں ہم اپنی اسلامی حیثیت کو نقصان پہنچائے بغیر اخذ کر سکتے تھے لیکن اس عمل سے پہلے مغرب کے تمدّنی نظام اور عقلی ارتقا کا گہرا علم حاصل کرنا ضروری تھا اور یہ اسی وقت حاصل ہو سکتا تھا جب مسلمان انگریزی تعلیم کی طرف مائل ہوتے۔ اس پیش بندی کے ساتھ کہ مغربی تمدّن کے باطل تصوّرات و افکار کا مقابلہ کرنے کے لئے پہلے سے ایک علمی تحریک پیدا کر دی جاتی۔ یہ کام علماء ہی کا تھا۔ لیکن انہوں نے نہ اس کام کو کیا اور نہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی اشاعت پر صبر کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ میں جہاں بہت سی اعلیٰ صفات پیدا ہو گئیں وہاں بہت سے خطرناک رجحانات پیدا ہو گئے جنہوں نے مذہب کی طرف سے ان کے دلوں کو پھیر دیا۔ انگریزی تعلیم کی اشاعت کو تو علماء اپنی تمام کوششوں کے بعد بھی روک نہ سکے اور روکتے کیسے؟ وقت کے مطالبات ایک سیلاب کی طرح انسان کو بہا لے جاتے ہیں۔ اور کوئی قوّت ان مطالبات کی تکمیل کو روک نہیں سکتی ہے پھر اگر اس کام کو انجام دیا تو اُسی سر سیّد نے جس کو مُلحد اور بے دین کہا گیا تھا۔ اسی نے اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے تصنیف وتالیف کا کام شروع کیا۔ اُسی نے عیسائی مشنریوں سے ٹکر لی۔ اُسی کی

شخصیت تھی جس نے انگلستان کے دار الخلافہ میں بیٹھ کر انگریزی زبان سے لاعلمی کے باوجود برٹش میوزیم کا کونا کونا چھان مارا اور سر ولیم میور کے اغلاط و ہفوات کا مسکت جواب دیا۔ یہ تھی سر سیّد کی عزیمت اور دوسری طرف ہمارے علماء اپنے حجروں میں بیٹھے اس پر لعنت و ملامت کی بوچھاڑ کرتے رہے اور وقت کے اصلی کام کی طرف ایک قدم تک نہ اُٹھایا۔ سر سیّد کے متعلق تو خیر کہا جا سکتا ہے کہ وہ مغرب کی علمی اور تمدنی ترقی سے زیادہ مرعوب ہو گئے اور مرعوبیت کی وجہ سے کبھی کبھی ان کے قدم صراط مستقیم سے بھٹک جاتے تھے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سید اسمٰعیل شہید، مولانا حمید الدین فراہی اور علاّمہ شبلی نے کیا کیا تھا کہ انہیں علما نے ملحد و بے دین کہا اور ان کے خلاف کفر کے فتوے دیئے حالانکہ یہ وہ لوگ تھے جن کی زندگیاں صرف اسلام کی خدمتگذاری میں گزریں اور جن کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا مذہب تھا پھر بھی کہنا پڑتا ہے کہ علماء کی جماعت نے اپنا منصب بس یہ سمجھ رکھا ہے کہ خود کچھ کریں نہ کریں لیکن جو لوگ اسلام کی خدمت کا بار اپنے ذمہ لیں اور اس کی خدمت کو اپنا دین و ایمان تصور کریں ان کی غلطیوں اور فروگزاشتوں کو اچھالا کریں اور موقع ملے تو انہیں کافر و ملحد اور بے دین مشہور کریں ✣

ہندوستان اور اسلامی ممالک پر مغربی تسلّط قائم ہوئے ایک مدت ہو چکی ہے۔ اس عرصہ میں ہمارا ماحول، ہمارا تمدن ہمارے

افکار و میلانات غرضیکہ ہماری ساری دنیا بالکل بدل گئی ہے۔ مغرب کا فلسفہ اس کا تصوّرِ حیات اور اس کا طریق فکر ہماری ساری زندگی پر نہ مٹنے والے نقوش قائم کر چکا ہے۔ لیکن ہمارے مذہبی علوم آج بھی وہیں ہیں جہاں حضرت امام ابوحنیفہ کے زمانہ میں تھے۔ ان میں ایک شوشہ کی ترمیم یا اضافہ نہیں ہؤا۔ یورپ کے اس فکری غلبہ کا مقابلہ کرنا ہمارے علماء کا سب سے پہلا کام ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ جب تک میدانِ فکر میں اُن تصوّرات کی جیت قائم رہے گی جو مغربی تمدّن اپنے ساتھ لایا ہے اس وقت تک اسلامی افکار و عقائد کی گرفت حسبِ سابق ڈھیلی رہے گی۔ ضرورت اس کی تھی کہ مغربی فلسفہ کے توڑ پر ایک نیا اسلامی فلسفہ مرتب کیا جاتا۔ مغرب کے معاشی نظریات کے جواب میں اسلام کا معاشی نظریہ پیش کیا جاتا جس سے اسلامی معاشیات کا ایک مستقل علم وجود میں آجاتا۔ مغرب کے سیاسی نظام اور سیاسی فلسفہ کے خلاف اسلام کے سیاسی فلسفہ کی تشریح و توضیح کی جاتی اور اس طرح ان غلط نظامات کی بیخ کنی کی جاتی جنہوں نے موجُودہ زمانہ کی سیاسی زندگی میں ابتری پیدا کر دی ہے لیکن ہمارے علماء ان سب فرائض سے غافل یا تو سیاست کے میدان میں بے سمجھے بُوجھے اسلام کے مخالفین اور مسلمانوں کے دشمنوں کا تتبّع کر رہے ہیں یا چھوٹے چھوٹے اعتقادی مسائل کے پیچھے اپنی قوتیں ضائع کر رہے ہیں در حقیقت جس کام کی طرف

اوپر اشارہ کیا گیا ہے وہ اس کی اہلیت ہی سے محروم ہیں۔ ان کا طرز تفکر زمانہ کے رہوار سے صدہا برس پیچھے ہے۔ ان کا طریق بحث و استدلال بھی اتنا ہی پرانا ہے جتنا ہماری فقہ کا موجودہ نظام۔ مسائل حاضرہ سے یک قلم ناواقف، تحریکات جدیدہ سے یکسر لاعلم، ان کی ذہنی تعمیر میں قدامت فکر کی روح رچی بسی ہوتی ہے +

موجودہ دور میں صرف ایک شخصیت ایسی نظر آتی ہے جس نے ایک نئے اسلامی نظام کی تعمیر کی ضرورت محسوس کی ہے اور اپنی مقدور کے موافق اس کام کو انجام دینے میں ہمہ تن مصروف عمل ہے یہ شخصیت سید ابو الاعلےٰ مودودی صاحب کی ہے۔ جنکی اسلامی بصیرت نے زمانہ کی ذہنی تحریکات کو خوب سمجھ لیا ہے اور جو ایک نئے علم کلام کی داغ بیل ڈال رہے ہیں موجودہ علما میں اسلام کو صحیح طور سے پیش کرنے اور نوجوان تعلیم یافتہ لوگوں کو مغرب کی ذہنی غلامی سے بچانے کا گر صرف سید صاحب موصوف کو آتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ اس کام میں تنہا ہیں اور نقارخانہ میں اس طوطی کی آواز کا اثر دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انہیں اپنے مقاصد میں کامیابی دے اور مسلمان ان کی قدر و قیمت کو پہچانیں۔ مولانائے موصوف ان معدودے چند دیانتدار اور حق پرست علماء میں سے ہیں جنہیں مسلمانوں کی تمام سیاسی جماعتوں سے اختلاف ہے اور وہ ہر ایک جماعت کے نقائص اور کمزوریوں پر

حق گوئی اور بیباکی کے ساتھ تنقید کیا کرتے ہیں۔ میرے نزدیک آپ کی دیانت و حق پرستی مسلّم ہے لیکن پھر بھی مجھے آپ کے طریق کار سے اختلاف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں جبکہ مسلمانوں میں کسی قدر سیاسی شعور پیدا ہو رہا ہے مسلمانوں کی تمام سیاسی اور نیم سیاسی جماعتوں پر ایک ہی لہجہ میں نکتہ چینی کرنا سب کو یکساں مذموم اور گمراہ کن بتلانا اور سب کو ایک ہی سطح پر لے آنا اس کے سوا کوئی نتیجہ نہیں پیدا کر سکتا ہے کہ مسلمان فکری انتشار اور عملی جمود میں مبتلا ہو جائیں۔ ایک شخص جب یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کی ہر جماعت اسلام کے مرکزی تخیّل سے ہٹی ہوئی ہے اور اپنے عمل و مسلک سے اسلام کو نقصان پہنچا رہی ہے تو مسلمانوں کے دلوں پر اس طرز تنقید کا کیا اثر پڑے گا؟ صرف یہی کہ اگر وہ اس تنقید کی صحّت کے قائل ہو گئے تو ہر جماعت سے اپنا تعلّق منقطع کر لیں گے اور اس طرح اجتماعی طرز عمل سے دُور اور انفرادیّت کی کھلی ہوئی بُرائیوں میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس قسم کی ہمہ گیر تنقید اسی وقت جائز قرار دی جا سکتی ہے جب تنقید کرنے والا شخص اپنا ایک متعین پروگرام رکھتا ہو اور اپنی علیحدہ جماعت[1] بنا چکا ہو نیز اس کا یہ پروگرام اور اس کی جماعت اتنی معروف ہو چکی ہو کہ وہ مسلمان کو مخاطب کر کے یہ کہہ سکے کہ صحیح جادۂ عمل یہ ہے جسے میں نے اور میری جماعت نے اختیار کیا ہے اس لئے اگر تم اسلام کے سچّے پیرو ہو تو دُوسری کام

[1] الحمدللہ سید صاحب موصوف کے گرد ایک جماعت بن گئی ہے جس کا دستور اساسی بھی شائع ہو گیا ہے (محمد شاہ)

جماعتوں سے اپنا رشتہ کاٹ لو کیونکہ سب یکساں گمراہ ہیں اور میری جماعت میں شامل ہو جاؤ۔ اس وقت بیشک مسلمانوں کے سامنے اجتماع و عمل کی ایک راہ ہوگی اور وہ اُسے اختیار کرنے پر خود بخود آمادہ ہو جائیں گے لیکن اگر اس قسم کی کوئی جماعت موجود نہ ہو یا اگر ہو تو گمنامی کا پردہ اُسے چھپائے ہوئے ہو اور اس پر بھی تنقید کرنے والا کہے کہ مسلمانوں کی تمام جماعتیں ان کو ہلاکت کی طرف لئے جا رہی ہیں اور نتائج کے لحاظ سے کسی جماعت کو دوسری پر ترجیح نہیں دی جا سکتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان بھونچکا ہو جائیں گے کہ وہ آخر کریں کیا؟ کس کا ساتھ دیں کس کا نہ دیں؟ کس کی آواز پر لبیک کہیں؟ انجام یہ ہوگا کہ حرکت و عمل کا ہر اقدام رُک جائے گا۔ تمام جماعتیں ٹوٹ جائیں گی اور کوئی جماعت باقی نہیں رہے گی جس کے ساتھ مسلمان تعاون کر سکیں +

مقصود یہ نہیں ہے کہ اسلامی جماعتوں پر کسی قسم کی تنقید ہی نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اس شخص کو جو سب جماعتوں کو گمراہ قرار دیتا ہے تنقید کرتے ہوئے ہمیشہ اس امر کی وضاحت کرنی چاہیئے کہ ان جماعتوں میں اپنی خرابیوں اور گمراہیوں کے باوجود ترجیح کس کو حاصل ہے اور کس کی طرف جانے سے مسلمانوں کو نقصان کم ہوگا۔ یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ آپ مسلم لیگ، کانگریس، احرار اور خاکسار سب کو ایک ہی ڈنڈے سے ہنکا لئے اور سب پر ایک

ہی لب و لہجہ میں تنقید کیجئے۔ یہ ممکن ہے کہ ان سب جماعتوں میں نقائص ہوں یہ سب کی سب بنیادی کمزوریوں میں مبتلا ہوں لیکن اس کے بعد بھی یہ بات باقی رہ جاتی ہے کہ ان میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جاسکتی ہے اور بعض کی کمزوریاں اور نقائص دوسروں سے کم مضرت رساں ہیں لہذا تنقید کے وقت اس چیز کو صاف کہہ دینا چاہیئے تاکہ مسلمان جس راہ کو اپنے لئے کم مضرت رساں خیال کریں اس کے ساتھ ہولیں یہ کہہ کر کہ ان میں سے کوئی اس قابل نہیں ہے کہ مسلمان اس کے لئے اپنی قوت و توانائی اور روپیہ پیسہ اور وقت برباد کریں دراصل مسلمانوں کے حرکت و عمل کا جذبہ کمزور کیا جا رہا ہے۔ جب ہر جماعت یکساں گمراہ ہے تو پھر بیکار اپنا وقت اور پیسہ ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔ چلو گھر بیٹھو، ہنسی خوشی زندگی گزارو جو کچھ ہونا ہے ہو کر رہیگا اس قسم کی تنقید یہ ذہنیت پیدا کر رہی ہے۔ حالانکہ عمل اور حرکت کا ولولہ ہر صورت میں قیمتی ہے خواہ اس کا رُخ غلطی اور گمراہی کی جانب ہی کیوں نہ ہو حرکت غلط ہی سہی، عمل بے مقصد ہی سہی، جمود اور بے عملی سے بدرجہا بہتر ہے۔ کیونکہ غلط عمل سے جو بُرے نتائج پیدا ہوتے ہیں بعد میں اُن کا مداوا کیا جا سکتا ہے لیکن اگر عمل کی قوت اور حرکت کا ولولہ ہی سرد پڑ جائے تو بہتری کی اُمید کا بھی خاتمہ ہے آپ جنوب کی طرف جانا چاہتے ہوں لیکن پشاور لیجانے والی سڑک پر چلنے لگیں یہ اُس سے کہیں بہتر ہے کہ آپ نہ اِدھر جائیں نہ اُدھر

جائیں بلکہ اپنی جگہ پر کھڑے رہیں یہاں تک کہ آپ کے اعضا شل ہو جائیں اور چلنے کی قوّت ہی فنا ہو جائے ۔ یہ ممکن ہے کہ آپ راس کماری جانے کے لیے پشاور کی سڑک پر شمال کا رُخ کریں ۔ آپ منزلِ مقصود سے دُور ہوتے جائیں گے کبھی نہ کبھی تو آپ کو غلطی کا احساس ہوگا ۔ ممکن ہے آپ پشاور کے قریب پہنچ کر اپنی غلطی کا احساس کریں اور پھر اُلٹے پاؤں واپس آئیں یہاں تک کہ راس کماری پہنچ جائیں ۔ لیکن اگر راستہ میں کھڑے کھڑے آپ کے پیر شل ہو گئے اور آپ حرکت کرنے سے معذور ہو گئے تو نہ آپ پشاور ہی پہنچیں گے اور نہ راس کماری ۔ افسوس کہ علماء نے اس حقیقت کو ہمیشہ نظر انداز کیا ورنہ وہ سلبی تنقید کے بجائے مثبت عمل پر آمادہ ہو جاتے ۔ ہمہ گیر تنقید انتہائی خطرناک اور مہلک ہے جب تک کہ اس کے ساتھ یہ وضاحت نہ ہو کہ جن اشخاص یا جماعتوں پر تنقید کی جا رہی ہے ان میں ترجیح کس کو حاصل ہے اور سب سے کم بُرائی اور نقصان کس کے عمل سے پیدا ہوتا ہے +

اس قسم کی تنقید وہ ہے جو اتاترک رضا شاہ اور مسلمانوں کے بعض دُوسرے لیڈروں پر کی جاتی ہے ۔ ان حضرات سے شکوہ یہ ہے کہ مسلمان ہوتے ہوئے انھوں نے اپنی قوم اور اپنے ملک سے اسلامی تمدن اور شعائر کو نکال باہر کیا ۔ اسلامی قوانین کی جگہ مغربی قوموں کا قانونی نظام مستعار لے کر اُسے رائج کرنا چاہا ۔ یہ سب

صحیح ہے لیکن تصویر کے دُوسرے رُخ کو بھی دیکھنا چاہیئے۔ جس چیز کو اسلامی قوانین کہا جاتا ہے اُس سے مُراد فقہی نظام ہے جسے عباسی حکومُت کے عہد میں مسلمان فقیہوں نے قرآن وسنّت کی روشنی میں مرتّب کیا تھا۔ یہ قوانین اور یہ فقہی نظام عباسیہ حکومت کی ضرورت کے لِئے بنائے گئے تھے اور اُس خاص زمانہ اور وقت کے لئے تھے۔ لیکن اگر آپ یہ چاہتے کہ آج کل کوئی حکومت ان قوانین کی بنیاد پر اور اس فقہی نظام کی مدد سے اپنا کام چلائے تو یہ اس بات کا ثبوت ہو گا کہ آپ دُنیا کے موجُودہ سیاسی اور معاشی نظام سے بالکل لاعلم اور ناواقف ہیں۔ موجُودہ دَور میں جب تک کہ ہماری پرانی فقہ پر نظر ثانی نہ کی جائے۔ اس کے بعض اجزا میں ترمیم واضافہ نہ کیا جائے اور بعض نئے اجزا کا اس میں پیوند نہ لگایا جائے اس وقت تک وہ زمانہ کی ضروریّات اور حالات کی تبدیلی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ پھر یہ کام کس کا ہے؟ علماء کا ہے یا اتاترک اور رضا شاہ جیسے لوگوں کا؟ ان لوگوں نے جب حکومت پر قبضہ کیا اور اس کی مشینری کو چلانا شروع کیا تو ان کے سامنے وہ پُرانا فقہی نظام تھا جس کو انہوں نے بالکل ناکام خیال کیا اور چونکہ بعض دُوسرے اسباب کی بنا پر ان کو مذہب کے رائج الوقت تصوّر سے ایک گونہ عداوت ہو گئی تھی اس لئے انہوں نے بلا تکلّف مغربی اقوام کے قوانین سے مدد لی۔ یہ کام تو ہمارے علماء

کا تھا کہ وہ قرآن و حدیث کی روشنی میں موجودہ ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے اس فقہ پر نظر ثانی کرتے اور اس کو از سر نو ترتیب دیتے۔ اگر اس قسم کا کوئی فقہی نظام ہمارے علماء نے ترتیب دیا ہوتا اور اس کے بعد بھی اتاترک اور رضا شاہ نے اس کی جگہ مغربی قوانین سے استفادہ کیا ہوتا تو بے شک وہ اصلی ملزم تھے لیکن حقیقت دیکھی جائے تو اس صورت حال کا الزام نصف اتاترک اور رضا شاہ کے سر پر ہے اور بقیہ نصف علمائے کرام کے سر۔ اتاترک اور رضا شاہ کی حکمت عملی کو مورد ملامت بناتے ہوئے ان حالات و واقعات کو بھی نظر کے سامنے رکھنا چاہیئے جن کے درمیان ان کی ذہنی نشو و نما ہوئی اور جن کے اثرات ان کے اعمال کے محرک ہوئے۔ وہ ایک ایسی فضا کے مخلوق تھے جہاں علما اور مشائخ ایک رجعت پسند استبدادیت کا آلہ کار بنے ہوئے تھے جہاں مذہب کو سیاسی اغراض کا غلام بنا لیا گیا تھا جہاں ظواہر پرستی اور رسمیت نے مذہب کے اصلی خدّ و خال بالکل مسخ کر دیئے تھے۔ رضا شاہ اور اتاترک کی مذہبی پالیسی علمائے وقت اور رہنمایان مذہب کے کرتوتوں کا قدرتی ردّ عمل تھی مذہب سے بے اعتنائی مغربی تمدّن سے مرعوبیت مذہب و سیاست کی ناپاک تفریق غرضیکہ وہ تمام صفات جن کا اتاترک نمائندہ تھا وقت کے مذہبی جمود اور دینی انحطاط سے پیدا ہوئے تھے۔ یہ لوگ اپنی آنکھوں سے

دیکھ رہے تھے کہ کس طرح ملک میں باہمی نزاع وفساد اور آپس کی خونریزی کے بانی مبانی وہ لوگ تھے جو مذہبی عقائد کی بنا پر طرح طرح کے جھگڑے اور لڑائیاں پیدا کرتے تھے۔ جنہیں اصلاحِ اعمال اور تزکیہ نفوس سے کوئی غرض نہ تھی۔ جن کا شیوہ یہ تھا کہ جزویات وفروعات پر اسلام کے مرکزی تخیّل اور مذہب کے اصلی مقاصد کو قربان کر کے روزانہ نئے مذہبی اور سیاسی فتنے اٹھایا کریں اور اس کے بعد جب مسلمانوں کے مختلف فرقے آپس میں دست وگریبان ہو جائیں تو خود بیٹھ کر تماشا دیکھیں۔ ان حالات کا اثر ان کے دِل ودماغ پر جو کچھ ہُوا وہ بالکل ظاہر ہے۔ مذہب کے اصلی حُسن وجمال کا نظارہ انہوں نے اپنے گردوپیش نہیں دیکھا۔ مذہب کی جان بخش رُوح اور حرکت وعمل کے جو مخفی خزانے اس کی ظاہری سطح کے نیچے دبے ہوتے ہیں، ان کی نظروں سے رُوپوش تھے۔ اس لئے جب انہوں نے وہ مکرُوہ شکل دیکھی جس کو علماء اور عوام مذہب کے نام سے تعبیر کرتے تھے تو ان کے دل مذہب کی طرف سے ہٹ گئے اور انہوں نے مذہب کو سیاست کے دائرہ سے بالکل خارج کر دیا۔ ایسا کرنے میں وہ بالکل حق بجانب تھے اس لئے کہ اگر مذہب کی وہ شکل وصُورت باقی رہتی تو نہ مذہبی اصلاح کا کوئی امکان تھا اور نہ دُنیوی فلاح کا +

آج ہندوستان کی اسلامی سیاست میں بھی انہی رجحانات

کو صاف دیکھا جا رہا ہے جو ترکی اور ایران میں جنگ عظیم سے پہلے نمودار ہو رہے تھے۔ یہاں بھی مذہب کو اسی طرح سیاست کا ایک داؤں بنایا جا رہا ہے۔ ترک موالات کے زمانہ کو یاد کیجئے جب علماء کے ایک گروہ نے قرآن سے ترک موالات کی فرضیت کو ثابت کیا تھا اور اس کے مخالف گروہ نے حکومت کے ساتھ تعاون کرنے کو قرآن ہی کی رُو سے جائز اور مستحسن قرار دیا تھا۔ جب خدا اور رسُول کے احکام کے ساتھ اس طرح مذاق کیا جائے جب قرآن و حدیث کو اپنے اپنے آراء و ہوا کے مطابق توڑ مروڑ لیا جائے، جب مذہب کو ایک پیشہ بنا کر اُس سے کمائی حاصل کی جائے، جب وقت کے ناگزیر تقاضوں سے اعراض برتا جائے اور بالکل غیر ضروری جزویات و فروعات پر دین و ایمان کا مدار رکھا جائے، جب مذہب کے نام پر نئے نئے فتنے برپا کئے جائیں، جب ایک طرف قوم کی زندگی اور موت کا سوال درپیش ہو اور دوسری طرف مدح صحابہ اور تبرہ جیسی تحریکوں پر اسلامی فرقوں کو ایک دوسرے سے لڑایا جائے تو ضرور بالضرور مذہب کو سیاست سے خارج کر دینا چاہیئے ورنہ دین و ایمان کے ساتھ دنیاوی ترقی اور مادی فلاح کی امید بھی رخصت ہو جائے گی بلا شبہ یہ بہتر ہے کہ انسان دنیا اور دین دونوں کو کھونے کے بجائے صرف دین ہی کھو بیٹھے سب سے بہتر تو یہ ہو تاکہ دنیا اور دین دونوں کی نعمتیں

اور برکتیں حاصل ہوتیں لیکن مذہب کی موجودہ صورت سے جیسی کچھ بھی وہ ہے یہ امید نہیں کی جاسکتی ہے کہ اس سے ہماری دینی فلاح ایک انچ بھی قریب لائی جاسکتی ہے کیا ہمارے علمائے کرام اب بھی اپنے اصل فرائض سے غافل اور کانگرسی سیاست کے ناپاک دامن سے لپٹے رہیں گے۔ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ترکی اور ایران کی تاریخ ہندوستان میں بھی دُہرائی جائے گی اور اس کی پوری ذِمّہ داری ان پر ہو گی +

استدراک:- میرے محترم دوست صدیقی صاحب نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ اکثر و بیشتر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ آپ نے مولانا کی بے لاگ تنقید کو جس سے مسلمانوں کی کوئی جماعت نہیں بچ سکی، دیکھ کر یہ سمجھ لیا ہوگا کہ مولانا بھی اُسی قسم کی تخریبی تنقید کی رَو میں بہ رہے ہیں جو عام طور پر ہمارے علماء کا طغرائے امتیاز ہے۔ مگر یہ حقیقت نہیں۔ مولانائے موصوف نے جہاں اس عالمانہ تنقید سے یہ ثابت کیا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی کوئی جماعت بھی اُس شاہراہ پر نہیں چل رہی جو اسلام کی شاہراہ کہی جاسکتی ہے، وہاں خود اہل حق کی ایک جماعت بنا کر اور اُس کا دستور اساسی شائع کر کے یہ بھی دکھا دیا ہے کہ مسلمانوں کو اس قسم کی ایک جماعت کی ضرورت ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے یہ جماعت حیرت انگیز رفتار سے منظم ہو رہی ہے اور خدا کو منظور ہوا تو مستقبل قریب ہی میں اس کی جدوجہد کے مفید نتائج دنیا کے سامنے آنے شروع ہو جائیں گے +

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے پیش نظر حیات انسانی کے وہ تمام مسائل ہیں جن کے حل کی اس وقت ضرورت ہے تفصیل کیلئے مولانا کا مشہور ماہوار رسالہ **ترجمان القرآن** اور اُن کی تالیفات کا مطالعہ کیا جانا چاہیئے +

(محمد شاہ)

سِلسلۂ مطبُوعات اِقبال اکیڈیمی!

۱- یادِ اقبال علاّمہ اقبال کی وفات پر ہندوستان کے جلیل القدر شعراء نے مرحُوم کو جو خراجِ تحسین ادا کیا تھا۔ اُسے ایک مجموعۂ کی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اور اُردو ادب میں یہ ایک گرانمایہ اضافہ ہے:۔

قیمت ایک روپیہ چار آنہ (عہ ر)

۲- حیات مُفتی محمدؒ عبدہ علاّمہ جمال الدّین افغانی کے شاگرد رشید اور دست راست مفتی محمد عبدہٗ مصری کے حالات زندگی اور شاندار کارناموں کی تفصیل۔ اُردو زبان میں اس موضوع پر پہلی کتاب ہے:

قیمت بارہ آنہ (۱۲ر)

۳- تعلیماتِ اقبال علاّمہ اقبال نے اپنی قوم کو جن باتوں کی تلقین کی ہے انکو ایک مجموعہ کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہ کتاب دراصل علاّمہ کی تمام کتابوں کا نچوڑ اور تشریح ہے:۔ قیمت ایک روپیہ (عہ ر)

۴- شرحِ اسرارِ خودی علاّمہ اقبال کے فلسفہ خودی کو سمجھے بغیر علاّمہ کے کلام کو سمجھنا از حد مشکل ہے علاّمہ نے اس فلسفہ کو مثنوی اسرار خودی میں پیش کیا ہے۔ فارسی زبان اور فلسفیانہ انداز میں ہونے کیوجہ سے یہ کتاب عوام کی دسترس سے بہت دُور تھی۔ اس شرح کے مطالعہ سے فلسفہ خودی کے دقیق سے دقیق مسائل آپکے لئے بالکل آسان ہو جائیں گے:۔ قیمت ایک روپیہ (عہ ر)

مِلنے کا پتہ:۔ **دفتر اقبال اکیڈیمی ظفر منزل۔ تاج پورہ۔ لاہور**

PRESSBOARD
PAMPHLET BINDER
Manufactured by
GAYLORD BROS.

ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال رح کے افکار، عقائد اور پیغام کے واحد مبلّغ،
ماہ نامہ

پیغامِ حق لاہور

کا مُطالعہ کیجیے

جو مُلک کے مشہور انشاپردازوں کے زیرِ ادارت ہر ماہ
باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے

قیمت سالانہ چار روپے نمونے کا پرچہ ۶ آنے

مینجر رسالہ "پیغامِ حق"۔ ظفر منزل تاجپورہ، لاہور

۲

. Dīn
bil
00

RBSC
URDU
AZ771
S544
1942